کے زیرِ اثر ہوتا ہے۔ اُس کے افعال کبھی ایک تصور کے ماتحت اور کبھی دوسرے تصور کے ماتحت ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ لیکن رفتہ رفتہ جوُں جوُں اس کی عمر اور اس کے تجربہ میں اضافہ ہوتا جاتا ہے وہ زیادہ سے زیادہ اس قابل ہوتا جاتا ہے کہ ان تصورات کا مقابلہ ایک دوسرے سے کر کے یہ دیکھے کہ ان میں سے کون سا تصوّر ایسا ہے جسے وہ درحقیقت چاہتا ہے اور جس کے لیے اُسے دوسرے تصوّرات کے تقاضوں کو قربان کرنا چاہیے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بالآخر وہ ایک کے سوائے باقی تمام تصوّر کو رد کر دیتا ہے اور یہ تصوّر اس کا نصب العین اور اس کی ذات کا مرکز فکر و عمل بن جاتا ہے اور اس کی شخصیّت کو متحد اور منظم کر دیتا ہے۔

اگر کوئی شخص ایسا ہو جو یہ سمجھتا ہو کہ وہ دو نصب العینوں سے بیک وقت محبّت کر سکتا ہے اور کر رہا ہے مثلاً عیسائیت اور انگریزی وطنیت کے نصب العینوں سے۔ تو جونہی کہ اُس کو ایسے حالات کا سامنا کرنا پڑے گا جن میں ان دونوں نصب العینوں کے تقاضے ایک دوسرے کے خلاف ہوں گے اس کی یہ غلط فہمی دُور ہو جائے گی۔ اُسے معلوم ہو جائے گا کہ اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ ایک نصب العین کے تقاضوں کو پُورا کرنے کے لیے دوسرے نصب العین کے تقاضوں کو نظر انداز کرے اور یہ کہ اگرچہ وہ سمجھتا تھا کہ وہ بیک وقت دو نصب العینوں سے برابر کی محبّت کر رہا ہے تاہم اصل حقیقت یہ تھی کہ ان میں سے ایک نصب العین دوسرے کا محکوم اور خدمت گزار تھا۔ جب کوئی شخص سچ مچ بیک وقت دو یا تین مختلف نصب العینوں سے محبّت کر رہا ہو تو اس کا مطلب سوائے اس کے اور کچھ نہیں ہوتا کہ اُسے اپنے آپ کا علم اس قدر کم ہے کہ وہ وضاحت سے نہیں جانتا کہ جن نصب العینوں سے وہ محبّت کر رہا ہے وہ اُس سے عملی طور پر کیا چاہتے ہیں۔ کیونکہ دو مختلف نصب العینوں کے عملی تقاضے کبھی ایک نہیں ہوتے۔ مثلاً ایک فردِ انسانی کے لیے ناممکن ہے کہ وہ بیک وقت ایک اچھا عیسائی اور ایک اچھا کمیونسٹ یا ایک اچھا مسلمان اور ایک اچھا وطنیت پرست بن سکے ایک انسان کا سیاسی نصب العین اس کی پوری عملی زندگی پر حاوی ہوتا ہے۔ جب کوئی مذہب یا کوئی فلسفہ جس پر وہ یقین رکھتا ہو اُس کا سیاسی نظریہ نہ ہو تو پھر وہ ایک ایسے عقیدہ کی حیثیت رکھتا ہے جو اُس کے سیاسی نظریہ کے ماتحت رہتا ہے جو خود اس کے اعمال و افعال کو معین نہیں کرتا اور جس کے عملی تقاضے وہ وقتاً فوقتاً اپنے سیاسی نظریہ کی خاطر پامال کرتا رہتا ہے۔

سیاست، اقتصاد، تعلیم اور قانون کی بنیاد

ایک فرد کا نصب العین بالعموم بہت سے افراد کا نصب العین بن جاتا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ والدین اپنے نصب العین کی محبّت اپنی اولاد کو منتقل کرتے ہیں اور ان کی اولاد گھر کے تعلیمی ماحول کی وجہ سے اس محبّت کو اپنے والدین سے غیر شعوری طور پر اخذ کرتی ہے۔ جس طرح زندگی زندگی کو پیدا کرتی ہے اسی طرح سے محبّت محبّت کو پیدا کرتی ہے کیونکہ محبّت دراصل زندگی ہی ہے جو کائنات کی نفسیاتی سطح پر نمودار ہوتی ہے۔

وہ افراد جو ایک ہی نصب العین سے محبّت رکھتے ہوں ایک دوسرے کی طرف کشش محسوس کرتے ہیں اور ہم خیال لوگوں کی ایک جماعت کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ یہ جماعت قدرتی طور پر خاندان کے کسی بزرگ یا قبیلہ کے کسی سردار یا کسی بادشاہ یا قائد یا ڈکٹیٹر یا پریذیڈنٹ کے ماتحت منظّم ہو جاتی ہے۔ ہر منظّم جماعت کسی نہ کسی نصب العین پر مبنی ہوتی ہے اور ہر نصب العین جو زندہ رہتا ہے آخر کار ایک منظّم جماعت کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ نصب العین کی محبّت ماحول کے اثر سے جس میں والدین، بزرگ، استاد، دوست، اخبار، کتابیں، رسالے، ریڈیو، ٹیلیویژن وغیرہ شامل ہیں قوم کی آئندہ نسلوں کو منتقل ہوتی رہتی ہے اور اس کی روح کے طور پر قائم رہتی ہے۔ یہ ہے وہ طریق جس سے ایک نظریاتی جماعت خواہ اس کا نظریہ صحیح ہو یا غلط صدیوں تک زندہ رہتی ہے۔ زمانۂ حال کی منظّم نظریاتی جماعتوں کو ریاستیں کہا جاتا ہے۔

ایک نظریاتی جماعت یا ریاست کے تمام اعمال و افعال خواہ وہ سیاسی ہوں یا فوجی یا اقتصادی یا معاشرتی یا اخلاقی یا قانونی یا علمی یا تعلیمی یا فنی اس کے نصب العین کے ضابطۂ اخلاق سے معین ہوتے ہیں۔

ایک منظّم نظریاتی جماعت یا ریاست ایک زندہ جسم حیوانی کی طرح ہوتی ہے جس میں نصب العین کی محبّت قوّتِ حیات کا کردار ادا کرتی ہے اور قائد دماغ کا اور حکومت کے محکمے اس کے اعضائے رئیسہ کا کام دیتے ہیں۔ ایک نظریاتی جماعت کے افراد جس قدر زیادہ اپنے نصب العین سے محبّت رکھتے ہوں، اسی قدر زیادہ ان کی جماعت متحد اور منظّم اور طاقت ور ہوتی ہے اور محنت اور قابلیت سے کام کرنے کی استعداد رکھتی ہے۔

فردِ کے نصب العینوں کا ارتقا

نصب العین کی محبّت کا جذبہ فرد کی زندگی میں ابتدا ہی سے اپنا کام کرنے لگ جاتا ہے اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جُوں جُوں اس کی عمر ترقی کرتی جاتی ہے اور اس کے علم اور تجربہ میں اضافہ ہوتا جاتا ہے اس کے نصب العین بھی صحیح نصب العین کی سمت میں بدلتے اور ارتقاء کرتے جاتے ہیں۔

ایک بچّے کے لیے سب سے زیادہ تسلّی بخش اشیاوہ ہوتی ہیں جو اس کی جبلتی یا حیوانی خواہشات مثلاً کھانے پینے، مالک بننے، برتر اور غالب ہونے، مل کر کھیلنے، تعمیر کرنے وغیرہ کی خواہشات کی تشفی کر سکے لہٰذا اس کی صورت میں نصب العین کی محبّت کا جذبہ ایسی اشیاء کی محبت کی شکل اختیار کرتا ہے۔ جب بچّے کی عمر ذرا اور بڑھ جاتی ہے تو چونکہ اس کے والدین تمام دوسرے افراد کی نسبت اس سے زیادہ قریب ہوتے ہیں، جس کی وجہ سے وہ ان کو اچھی طرح سے جان لیتا ہے اور چونکہ وہ دیکھتا ہے کہ وہ اس کے بالمقابل ہر لحاظ سے بلند اور بالا اور برتر ہیں لہٰذا وہ ان کو اعلیٰ اور قابلِ ستائش ہستیاں سمجھنے لگتا ہے۔ اور وہ اس کا نصب العین بن جاتے ہیں لہٰذا وہ ان کی رضامندی یا پسندیدگی کی تمنا کرنے لگتا ہے اور اس کو حاصل کرنے کے لیے اس بات پر آمادہ ہو جاتا ہے کہ اپنے کردار کو مناسب قسم کے ضبط میں لائے اور جب بھی ضرورت پڑے اپنی جبلتی یا حیوانی خواہشات کو جو کبھی خود اس کا نصب العین بنی ہوئی تھیں اس نئے نصب العین کی خاطر قربان کر دے تھوڑے عرصہ کے بعد جب وہ اپنے اسکول کے استادوں کے ساتھ راہ و رسم پیدا کرتا ہے تو اس کے دل میں ان کی محبّت اور ستائش کا جذبہ پیدا ہوتا ہے اور وہ ان کو اچھائی اور کمال کا نمونہ سمجھنے لگتا ہے آگے چل کر اس کی محبّت کا جذبہ استادوں سے بھی برتر اور بلند تر اشخاص کی محبّت کے راستہ سے اپنا اظہار پانے لگتا ہے اور وہ قوم کے وہی عظیم افراد ہوتے ہیں جو اپنی مختلف حیثیتوں میں قوم کے راہ نماؤں اور خدمت گذاروں کے طور پر پوری قوم سے خراجِ تحسین وصول کر چکے ہوتے ہیں تھوڑے ہی عرصہ کے بعد اسے محسوس ہوتا ہے کہ ان عظیم اشخاص کی محبّت جو اس کے دل میں پیدا ہوئی ہے اس کا باعث یہ ہے کہ وہ حسن، نیکی اور صداقت کے بعض اوصافِ حمیدہ مثلاً رحم، ہمدردی، محبّت،

سخاوت، علم، دلیری، دیانتداری اور انصاف سے آراستہ ہیں۔ لہٰذا جس چیز سے درحقیقت اسکو محبت ہے وہ یہی اوصاف ہیں نہ کہ وہ افراد جن کی طرف یہ اوصاف منسوب کیے جاتے ہیں اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کا نصب العین اشیا اور اشخاص سے گزر کر اُن تصورات پر آجاتا ہے جو اس کے خیال میں ان اوصاف کے حامل ہوتے ہیں۔ مثلاً عیسائیت۔ قومیّت۔ انسانیّت، جمہوریّت، اشتراکیّت، فسطائیت وغیرہ۔

فرد کے نصب العین کے ارتقا کے ساتھ اس کے دائرۂ محبّت کی توسیع کچھ اس ترتیب سے انجام پاتی ہے سب سے پہلے اُسے فقط اپنی ذات سے محبّت ہوتی ہے پھر وہ اپنی ذات کو چھوڑ کر اپنے پورے خاندان سے محبّت کرنے لگتا ہے اور خاندان کی خاطر اپنی ذات کو قربان کرنے کے لیے آمادہ ہو جاتا ہے پھر اس کی محبّت کا دائرہ اور وسیع ہو جاتا ہے اور اس میں خاندان ہی نہیں بلکہ اس کے دوسرے رشتہ دار اور دوست بھی داخل ہو جاتے ہیں آخر کار پوری قوم بلکہ وہ تمام افراد جو اس کے نصب العین کو چاہتے ہیں اس کی محبّت کا مقصود بن جاتے ہیں۔ ابتداء میں ایک فرد کے دل میں بہت سے ایسے نصب العینوں کی محبّت جاگزیں ہوتی ہے جو ایک دوسرے کے پہلو بہ پہلو موجود رہتے ہیں اور جو اس کی شخصیّت کو اور اس کی عملی زندگی کو بہت سے الگ الگ بلکہ متضاد حصّوں میں تقسیم کیے ہوتے ہیں لیکن جب رفتہ رفتہ اس کے ذہن میں ان نصب العینوں کا مقابلہ اور موازنہ ایک دوسرے سے ہونے لگتا ہے تو بالآخر ایک وقت ایسا آجاتا ہے جب وہ یہ فیصلہ کرنے کے قابل ہو جاتا ہے کہ ان میں سے ایک سب سے اچھا اور سب سے اُونچا ہے اور یہ فیصلہ اس کی شخصیّت کو ایک مرکز بہم پہنچا کر متحد اور منظم کر دیتا ہے اور اس کی عملی زندگی میں بھی ایک مرکزیت یا وحدت پیدا کر دیتا ہے۔

ایک فردِ انسانی کے نصب العینوں کا ارتقا ٹھوس اشیا سے تصوّری حقائق کی سمت میں، غیر مستقل سے مستقل کی سمت میں، غیر مکمل سے مکمل کی سمت میں، متعدد سے واحد کی سمت میں، جزو سے کُل کی سمت میں اور حسن، نیکی اور صداقت کے پست درجوں سے بلند تر درجوں کی سمت میں ظہور پذیر ہوتا ہے اور جب ہم اس بات کو سامنے رکھیں کہ اُن کا ارتقا صحیح نصب العین کی سمت میں ہوتا ہے اور اُن کے ارتقا کی یہ سمتیں بالکل صحیح اور قدرتی نظر آتی تاہم ایک شخص کے نصب العین کا ارتقا بالعموم

(باقی صفحہ ۵۴ پر)

ڈاکٹر محمد رفیع الدّین مرحوم

حکمتِ اقبال

(۴)

حکمتِ اقبال کی خصوصیّت

اگر کسی حکمت کے متعلق یہ معلوم ہو جائے کہ وہ اس قسم کی ہے کہ جب اسے منظم کیا جائے تو تمام سچّی علمی حقیقتیں جو اس کے زمانہ تک دریافت ہو چکی ہیں سارے معلوم اور مسلّم منطقی اور عقلی اصولوں کے مطابق اس کے اندر سما جاتی ہیں اور جو آئندہ دریافت ہونے والی ہوں وہ بھی اس کے اندر جذب ہو سکتی ہیں تو اس سے بڑھ کر کوئی ثبوت اس بات کا نہیں ہو سکتا کہ یہ حکمت جس وجدانی تصورِ حقیقت پر مبنی ہے وہ صحیح ہے اور خود یہ حکمت سچی اور پائیدار ہے اور تمام دوسری حکمتیں مٹ کر اس کی عالمگیر قبولیت کے لیے راستہ ہموار کریں گی۔ ظاہر ہے کہ جب ہم اس قسم کی حکمت کی بہترین تشریح کریں گے تو وہ اس کی عقلی اور علمی تنظیم اور ترتیب ہی کی صورت اختیار کریگی اور اس کے برعکس جب ہم اس کو ایک عقلی اور علمی ترتیب اور تنظیم کے ساتھ دوبارہ لکھیں گے، تو اس کی یہی ترتیب اور تنظیم اس کی بہترین تشریح قرار پائے گی۔

اقبال کی حکمت اسی نوعیّت کی ہے ایک سچی حکمت کے دو ضروری لوازمات جو اُوپر بیان کیے گئے ہیں اس میں موجود ہیں وہ حقیقتِ کائنات کے ایک ایسے تصور پر مبنی ہے جو صحیح ہے اور اس کے سارے معلوم اور مذکور تصورات منطقی اور عقلی طور پر اس مرکزی تصور سے مطابقت رکھتے ہیں حقیقتِ کائنات کا یہ صحیح تصور جو حکمتِ اقبال کا مرکز بھی ہے خدا کا تصور ہے اور اس کے دو پہلو ہیں ایک تو یہ کہ خدا انسان کو چاہتا ہے اور تخلیق اور تکمیلِ کائنات کا عمل در اصل تخلیق و تکمیلِ انسان ہی کا عمل ہے اور دوسرا یہ کہ انسان خدا کو چاہتا ہے اور اس کی زندگی کی ساری تگ و دو جو صحیح بھی ہو سکتی ہے اور غلط بھی صرف یہ مقصد رکھتی ہے کہ انسان خدا کو پہنچانے حقیقتِ کائنات کی حیثیّت سے یہ تصور نہ صرف واضح اور روشن ہے بلکہ صحت اور درستی کے تمام معیاروں پر پورا اُترتا ہے۔ اقبال نے اپنے تصورِ حقیقت کے تمام ضروری نتائج و مضمرات کو بالوضاحت اور

بالتکرار بیان کر دیا ہے۔ اگرچہ یہ نتائج اور مضمرات ایک ہی تصور کے ساتھ عقلی اور علمی تعلق رکھنے کی وجہ سے ایک نظامِ حکمت کی صورت میں ہیں۔ اور ایک عقلی اور منطقی تنظیم اور ترتیب پالینا ان کی فطرت میں ہے تاہم چونکہ وہ زیادہ تر شعر کی زبان میں بیان کیے گئے ہیں، وہ عقلی اور منطقی ترتیب اور تنظیم میں نہیں آسکے۔ ہو نہیں سکتا کہ ایک نظامِ تصورات شعر کی زبان میں بھی ہو اور پھر ایک منطقی اور عقلی ترتیب اور تنظیم بھی رکھتا ہو، ہو نہیں سکتا کہ وہ جذبات کی گرمی اور منطق کی ٹھنڈک دونوں سے بیک وقت بہرہ ور ہو۔ اقبال کا فلسفہ اس غیر معمولی ذہانت اور وجدانی قوت رکھنے والے ماہر ریاضیات یا ماہر فلسفی کی طرح ہے جس کا تصورِ حقیقت صحیح ہے لیکن وہ اپنے تصورِ حقیقت کے نتائج کو جو بے اختیار اس کے قلب پر وارد ہوتے چلے جاتے ہیں ایک منطقی ترتیب اور تنظیم میں رکھنے کی فرصت یا ضرورت نہیں پاتا تاہم اس کے نتائج اس قدر مفصل ہیں کہ ہر موزوں شخص جو اس کے تصورِ حقیقت کا صحیح وجدان رکھتا ہو بآسانی ان کے منطقی سلسلہ کے خلاؤں کو پُر کر کے ان کو ایک مکمل منطقی ترتیب اور تنظیم کا جامہ پہنا سکتا ہے۔ اقبال نے اپنے فلسفہ میں حقیقتِ انسان و کائنات کی اصل تصویر کا جو خاکہ پیش کیا ہے وہ اس قدر مکمل ہے کہ مناسب قابلیت کا ہر انسان جو اقبال کے ذوق سے آشنا ہو اس خاکہ میں صحیح رنگوں کو اپنی اپنی جگہ بھر کر تصویر کو اس کی پوری زیبائی اور دلکشی کے ساتھ جلوہ گر کر سکتا ہے۔

حکمتِ اقبال کی تشریح کا مطلب

اوپر کی بحث ہمیں جس اہم نتیجہ کی طرف راہ نمائی کرتی ہے وہ یہ ہے کہ اگر ہم چاہتے ہیں کہ اقبال کے فلسفہ کی ایک ایسی تشریح بہم پہنچائیں جو اس کے فلسفہ کو خواص اور عوام کے لیے اور غیروں اور اپنوں کے لیے مؤثر اور قابلِ فہم بنادے اور اس کی صحیح اور تسلی بخش تشریح قرار پائے تو ضروری ہے کہ ہم اقبال کے تصورِ حقیقت کے نتائج اور مضمرات کو جو اس نے بلا ترتیب شعر کی زبان میں بیان کیے ہیں نہ صرف یہ کہ ایک منطقی اور عقلی ترتیب کے ساتھ بیان کریں بلکہ ان کے درمیانی خلاؤں کو زیادہ سے زیادہ پُر کریں اور اس بات کی پرواہ نہ کریں کہ اس عمل سے اس کے فلسفہ کی تشریح کس قدر طویل ہو جائے گی کیونکہ یہ تشریح جس قدر طویل ہوگی اسی قدر زیادہ

اقبال کا فلسفہ قابلِ فہم اور اثر آفریں ہوگا اور لوگوں کے اعتقاد اور عمل کو بدلنے والی ایک قوّت ہوگا

غلط اور صحیح فلسفہ کے استدلال کا فرق

یہ حقیقت کہ ایک فلسفی کے استدلال کا آغاز اور انجام حقیقتِ کائنات کا ایک وجدانی تصور ہوتا ہے جو اس کے ذہن میں پہلے ہی سے موجود ہوتا ہے فلسفی کے استدلال کی سمت کو معیّن کر دیتی اور اس کی صحت اور عدمِ صحت کا فیصلہ کر دیتی ہے۔ اگر اس کا تصورِ حقیقت غلط ہوگا تو اس کے استدلال کی خشتِ اوّل ہی غلط رکھی جائے گی جس کے بعد اس کا سارا استدلال خواہ اس کی دیوار ثریا تک چلی جائے غلط ہو جائے گا چونکہ اس کے استدلال کا راستہ منزل سے ہٹا ہوا ہوتا ہے، یہ راستہ ٹیڑھا ہی نہیں ہوتا بلکہ دشوار گزار بھی ہوتا ہے اور اس راستہ پر چل کر اسے علمی حقائق کو اپنے تصورِ حقیقت کے مطابق ثابت کرنے میں بڑی دِقّت پیش آتی ہے اور پھر بھی وہ ان کو اپنے تصورِ حقیقت کے مطابق ثابت نہیں کر سکتا اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کے استدلال میں جا بجا عقلی اور منطقی خامیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ اپنے استدلال کی قوّت کو قائم رکھنے کے لیے کہیں تو وہ بعض سچے علمی حقائق کو جو اس کے غلط تصورِ حقیقت کی غمازی کرنے کی استعداد رکھتے ہوں نظر انداز کر جاتا ہے کہیں ان حقائق کی غلط توجیہہ اور تشریح کرتا ہے اور ان کو غلط طور پر توڑ موڑ کر سمجھتا اور سمجھاتا ہے۔ کہیں ان کی اہمیّت کو اتنا کم کر دیتا ہے کہ وہ اس کے تصورِ حقیقت کو چیلنج نہ کر سکیں اس کے برعکس کہیں وہ غلط علمی حقائق کو جنہیں اچھی طرح سے آزمایا اور پرکھا نہیں گیا اور جو اس کے غلط تصورِ حقیقت سے کسی قدر مناسبت رکھتے ہیں اپنے استدلال میں جگہ دیتا ہے اور ان کی اہمیّت کو بڑھاتا ہے کہ گویا وہی کائنات کی عقدہ کشائی کر سکتے ہیں وعلیٰ ہذا القیاس۔ لیکن اگر اس کا تصورِ حقیقت صحیح ہو اور وہ اُس تصور کو اور کائنات کے علمی حقائق کو جو اس کے زمانہ تک دریافت ہو چکے ہوں ٹھیک طرح سے سمجھتا ہو تو اس کا استدلال صحیح ہوتا ہے اور یہ تمام علمی حقائق آسانی کے ساتھ اس کے نظامِ حکمت میں اپنی جگہ پاتے جاتے ہیں اور وہ جہاں سے اسے مل سکیں تلاش کر کے لاتا ہے اور اپنے نظامِ حکمت میں جگہ دیتا جاتا ہے کیونکہ وہ اس کے تصورِ حقیقت سے مناسبت رکھتے ہیں اور اس کے لیے کار آمد ہوتے ہیں۔ اپنے استدلال کی

قوت کو قائم رکھنے کے لیے اگر اسے بعض غلط حقائق کو جنہیں علمی حقائق سمجھا جا رہا ہو توڑنا موڑنا یا بدلنا پڑتا ہے تو وہ اس طرح سے بدلتے ہیں کہ ان کی خامیاں اور کمزوریاں دُور ہو جاتی ہیں اور اگر بعض کو نظر انداز کرنا پڑتا ہے تو وہ درحقیقت غلط اور نظر انداز کرنے کے قابل ہی ہوتے ہیں اور اگر کہیں ان کی اہمیت کو کم کرنا پڑتا ہے تو فی الواقع ان کی اہمیت کم ہوتی ہے۔ اسی طرح سے اگر اسے بعض مفروضات کو اپنے نظامِ حکمت میں داخل کرنا پڑتا ہے تو زُود یا بدیر یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ وہ محض مفروضات ہی نہیں بلکہ تمام علمی اور عقلی معیاروں کے مطابق فی الواقع صحیح علمی حقائق ہیں گویا حقیقتِ کائنات کے تصور کی درستی اور درست فہمی اس کے سارے نظامِ حکمت کو درست کرتی ہے اور اس کے ساتھ بعض ایسے نام نہاد علمی حقائق کو بھی درست کرتی ہے جن کی نادرستی ابھی آشکارنہ ہوئی ہو۔ بلکہ بعض نئے درست علمی حقائق کی دریافت کی تحریک بھی کرتی ہے اس طرح درست تصورِ حقیقت کی مدد سے علم اپنے ہی تراشے ہوئے بتوں کو توڑتا ہوا صداقت کی منزلوں کی طرف نکل جاتا ہے۔ اقبال اسی بات کی طرف اشارہ کرتا ہے جب وہ کہتا ہے:

؎ وہ علم اپنے بتوں کا ہے آپ ابراہیم
کیا ہے جس کو خدا نے دل و نظر کا ندیم
وہ علم کم بصری جس میں ہمکنار نہیں
تجلیاتِ کلیم و مشاہداتِ حکیم!

علمی حقائق کی ترقّی سے غلط فلسفے مٹتے ہیں اور صحیح فلسفہ اُبھرتا ہے

چونکہ حقائقِ معلومہ و مُسلّمہ جو ایک نظامِ حکمت کی کڑیوں کی صُورت اختیار کرتے ہیں بداہتوں کے علاوہ علمی حقیقتوں پر بھی مشتمل ہوتے ہیں اور چونکہ علمی حقیقتیں ابھی تک سب کی سب دریافت نہیں ہو سکیں اور ہر فلسفہ ان کے ساتھ مطابقت بھی نہیں رکھتا اس لیے ہر فلسفہ کے اندر خلاؤں کا ہونا ضروری ہے اور چونکہ علمی حقیقتیں سب کی سب قیامت تک بھی دریافت نہ ہو سکیں گی۔ لہٰذا اس فلسفہ کے اندر بھی جو ان حقیقتوں سے پوری پوری مطابقت رکھتا ہو یعنی صحیح فلسفہ کے اندر بھی تا قیامت خلاؤں کا باقی رہنا ضروری ہے۔ بعض فلسفوں کے خلاؤں کی تعداد اور طوالت

زیادہ ہوتی ہے اور بعض کی کم یعنی بعض فلسفوں کا استدلال زیادہ گنجان ہوتا ہے اور بعض کا کم جس قدر کسی فلسفہ کے منطقی تسلسل میں خلاؤں کی تعداد زیادہ اور طوالت کم ہو گی یعنی جس قدر کسی فلسفہ کا استدلال زیادہ گنجان ہو گا اسی قدر وہ زیادہ آسان اور قابلِ فہم اور معقول اور مضبوط اور مکمل اور مدلّل سمجھا جائے گا۔ چونکہ سچی علمی حقیقتیں ایک دوسرے کے ساتھ عقلی ربط یا مطابقت رکھتی ہیں لہٰذا ایک دوسرے کی تائید اور توثیق کرتی ہیں اس کے برعکس چونکہ وہ غلط تصورات کے ساتھ کوئی عقلی ربط یا مطابقت نہیں رکھتیں، ان کی تائید اور توثیق بھی نہیں کرتیں اس بنا پر ضروری ہے کہ جوں جوں علم ترقی کرتا جائے اور علمی حقیقتوں کی تعداد بڑھتی جائے ان کی دلالت اور وضاحت بھی بڑھتی جائے اور ان کا توڑنا موڑنا یا مسخ کر کے سمجھنا اور سمجھانا زیادہ مشکل ہوتا جائے اور اس طرح سے صحیح فلسفوں کے خلاؤں کی تعداد و طوالت کم ہوتی جائے اور غلط فلسفوں کے خلاؤں کی تعداد اور طوالت بڑھتی جائے اور اس کے نتیجہ کے طور پر صحیح فلسفہ کی معقولیت کے ساتھ ساتھ غلط فلسفوں کی نامعقولیت زیادہ سے زیادہ آشکار ہوتی جائے۔ ضروری ہے کہ اس نہ رکنے والے قدرتی عمل کا نتیجہ یہ ہو کہ بالآخر دنیا میں صرف ایک ہی فلسفہ جو صحیح ہو اور کائنات کے صحیح تصور پر مبنی ہو اور اس بنا پر حال اور مستقبل کی تمام علمی حقیقتوں سے مطابقت اور مناسبت رکھتا ہو باقی رہ جائے اور باقی تمام فلسفے نامعقول اور بیکار سمجھ کر رد کر دیئے جائیں اس سے یہ ناگزیر نتیجہ بھی نکلتا ہے کہ یہی فلسفہ ہو گا جو بالآخر انسانیت کو متحد کرے گا اور جب تک یہ فلسفہ ظہور پذیر ہو کر دنیا میں پھیل نہیں جائے گا اس وقت تک نوعِ انسانی کا امن اور اس کا اتحاد دونوں ممکن نہ ہوں گے آگے چل کر میں عرض کروں گا کہ کیوں یہ فلسفہ اقبال کا فلسفۂ خودی ہی ہو سکتا ہے اور دوسرا کوئی فلسفہ نہیں ہو سکتا۔

شعر کی طرح فلسفہ بھی محبّت کا ترجمان ہے

حقیقت نہ صرف یہ ہے کہ فلسفی جب فلسفہ لکھتا ہے تو جذبات سے الگ ہو کر نہیں لکھتا بلکہ اس کے سارے جذبات اس تصورِ حقیقت پر مرتکز ہوتے ہیں جس کی تشریح وہ کر رہا ہوتا ہے اسے اس تصور سے عشق ہوتا ہے خواہ یہ تصور مادی ہو یا روحانی اور یہ بات بالکل ظاہر ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ جیسا کہ میں اوپر گزارش کر چکا ہوں حقیقتِ کائنات کا تصور ہر انسان کی عملی زندگی کی

قوّتِ محرکہ ہے اور فلسفی اس سے مستثنےٰ نہیں بلکہ وہ اس قوّتِ محرکہ کے زیرِ اثر اپنا سارا فلسفہ لکھتا ہے وہ چاہتا ہے کہ اس کا تصورِ حقیقت ہر جگہ قبول کر لیا جائے تاکہ لوگ اپنی عملی زندگی کو اس طرح سے بنائیں جس طرح سے وہ خود اپنی عملی زندگی کو بنانا چاہتا ہے تاکہ وہ ان فوائد سے مستفید ہوں اور ان نقائص سے بچ جائیں جنہیں وہ فوائد یا نقصانات سمجھتا ہے اور جن سے مستفید ہونا یا بچنا اس کی رائے میں اس کے فلسفہ کے بغیر ممکن نہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ فلسفہ شعر ہی کی طرح عشق کا اظہار ہے فلسفی جب اپنے عشق کو مقبولِ اذہان اور مرغوبِ خواطر بنانا چاہتا ہے تو سیدھی رو برو بات کہنے کی بجائے اپنے مخاطب کو بتاتا ہے کہ جس تصور کو وہ حقیقتِ کائنات سمجھتا ہے کیونکہ تمام علمی حقائق اسی سے مطابقت اور مناسبت رکھتے ہیں اور مل کر اس کی تائید اور توثیق کرتے ہیں اور فلسفی یہ طریقِ گفتگو اس لیے اختیار کرتا ہے کہ وہ جانتا ہے کہ وہ بے اثر نہ رہے گا۔ اس لیے کہ انسان کی فطرت یہ تقاضا کرتی ہے کہ اسے کوئی ایسا تصورِ حقیقت مل جائے جو فی الواقع تمام حقائق عالم کو اپنے ارد گرد منظّم کر سکتا ہو اور کرتا ہو اور اس تصور کے لیے وہ بے قرار رہتا ہے اقبال نے اس مضمون کو یوں بیان کیا ہے

ؔ فلسفہ و شعر کی اور حقیقت ہے کیا
حرفِ تمنّا جسے کہہ نہ سکیں رُو برو

علمی حقائق تنہا صحیح تصورِ حقیقت کی طرف راہ نمائی نہیں کر سکتے

لیکن فلسفی ایسے صحیح تصورِ حقیقت کو جو نہ صرف اس کے نظامِ حکمت کو معقول اور مدلّل بنا سکتا ہو بلکہ تمام نادرست علمی حقائق کو درست کر سکتا ہو اور نئے نئے درست علمی حقائق کی دریافت کے لیے راہ نمائی بہم پہنچا سکتا ہو کہاں سے لائے۔ ذہنِ انسانی حقیقتِ کائنات کے لاتعداد مادی اور رُوحانی تصوّرات قائم کر سکتا ہے کیونکہ اوصاف و خواص کی ذراسی تبدیلی سے تصوّر بدل جاتا ہے فلسفی یہ جاننا چاہتا ہے کہ ان گوناگوں تصوّرات میں سے کون سا تصوّرِ حقیقت ایسا ہے جو اپنی فطرت اور اپنے اوصاف و خواص کی بنا پر حال کے علمی حقائق کے ساتھ پوری پوری مطابقت رکھتا ہے کیونکہ اگر ایسا تصور مل جائے تو وہی مستقبل کے علمی حقائق کے ساتھ بھی مطابقت رکھے گا۔ لیکن علمی حقائق کی تعداد ہمیشہ اس قدر کم رہتی ہے کہ فقط ان علمی حقائق کی مدد سے از خود اس تصوّر کا

بجان لینا ایک فلسفی کے لیے بہت دشوار ہے اس قدر دشوار کہ اسے ناممکن کے درجہ میں رکھنا ضروری ہے۔ تاہم ہر ایک فلسفی نے کوشش کی ہے کہ اپنے زمانہ کے معلوم علمی حقائق کی بنا پر ایک تصوّرِ حقیقت قائم کرے اور پھر اس کی بنا پر ایک فلسفہ کی تعمیر کرے لیکن نتیجہ یہ ہے کہ ہر فلسفی کا تصوّرِ حقیقت ادھورا اور بیکار اور اس کا استدلال غلط اور نامعقول ہو کر رہ گیا ہے۔ آج تک کوئی فلسفی ایسا نہیں ہوا جس کے استدلال کی صحت یا معقولیت بجا طور پر دوسرے فلسفیوں کے شدید اعتراضات کی زد میں نہ آئی ہو فلسفیوں کے باہمی اختلافات کبھی ختم نہیں ہوتے۔ پھر اگر کوئی فلسفی دوسرے فلسفیوں کے اعتراضات کی روشنی میں اپنے فلسفہ کی اصلاح کرنا چاہے تو اس کوشش میں کبھی کامیاب نہیں ہوتا کیونکہ جب وہ اپنے غلط فلسفہ کی جو ایک غلط تصوّرِ حقیقت پر مبنی ہوتا ہے ایک خامی کو دُور کرنے کی کوشش کرتا ہے تو اس کے اندر اور خامیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔

اس کی مثال ایسی ہے کہ اگر ہم کسی کمرہ کے اندر ایک خوبصورت قالین جو کمرہ سے کسی قدر بڑا ہو اس طرح بچھانا چاہیں کہ وہ کمرہ میں پوری طرح سے پھیل جائے اور سارے گوناگوں نقوش جو اس کے اندر بن گئے ہیں پیشِ نظر ہو جائیں تو ہم اس مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکیں گے۔ کمرے کی تنگی کی وجہ سے قالین میں جا بجا شکن پڑ جائیں گے اور شکنوں کے اُوپر کے نقوش کا منظر بگڑ جائیگا یا نظروں سے اوجھل ہو جائے گا اور اگر ہم ان شکنوں کو ایک طرف سے ہٹانے کی کوشش کریں گے تو وہ کسی اور طرف ظاہر ہو جائیں گے اور اگر پھر اس طرف سے ہٹائیں گے تو ایک اور ہی طرف نمودار ہو جائیں گے یہی حال ایک ناقص اور ادھورے تصوّرِ حقیقت کا ہے کہ یہ خوبصورت کائنات اپنے گوناگوں دلکش حقائق کے سمیت اس کی تنگ دامانی کے اندر سما نہیں سکتی۔ اگر ہم اس کے ناقص تصوّرِ حقیقت کی بنا پر کائنات کا کوئی نظامِ حکمت تیار کریں اور اس طرح سے گویا کائنات کو اس کے اُوپر منطبق کرنے کی کوشش کریں تو کائنات اس پر پوری طرح سے منطبق نہیں ہو گی اور اس نظامِ حکمت کے استدلال میں جا بجا عقلی اور منطقی الجھنیں پیدا ہو جائیں گی اور ان الجھنوں کی وجہ سے حقائق علمی جا بجا مسخ ہو جائیں گے یا نظر انداز ہو جائیں گے اور اگر ہم ان الجھنوں کو نظامِ حکمت کے ایک گوشہ سے دُور کرنے کی کوشش کریں گے تو وہ اس کے دوسرے گوشوں میں نمودار ہو جائیں گی۔